حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۱۹

ارتقاء باطن

یا کرامی اذبحو ھٰذا البقر — ان اردتم حشر ارواح النظر

اے مہربانو اس گائے کو ذبح کرو — اگر تم چاہتے ہو کہ نظر کی روحیں اکٹھی ہو جائیں

از جمادی مردم و نامی شدم — ور نمامردم بہ حیواں سر زدم

جمادی حالت سے مرا تو نامی ہو گیا — نامی سے مرا تو حیوان ہو گیا

مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کے ز مردم کم شوم

حیوانی سے مرا تو آدمی ہو گیا — پھر کیا ڈروں کہ موت سے گھٹ جاؤنگا

حملۂ دیگر بمیرم از بشر — تا بر آرم از ملائک بال و پر

ایک دفعہ پھر بشر سے مروں تو — فرشتوں کے بازو اور پر نکال لوں گا

از ملک ہم باید جستن رجو — كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ

فرشتوں سے بھی (آگے) جست جو چاہیے — ہر شے ہلاک ہونیوالی ہے مگر اسکی ذات

بامد دیگر از ملک قرباں شوم — آنچہ اندر وہم ناید آں شوم

پھر ایک بار فرشتہ سے قربان ہو جائوں — وہ ہو جائوں جو وہم میں نہ آسکے

پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں — گویدم کانا الیہ راجعون

پھر عدم ہو جائوں ارغنوں کی آواز کی طرح — مجھے کہتا ہے ہم اس کی طرف رجوع کرنیوالے ہیں

(رومی)

ہندو اور بدھ مذاہب کا یہ بہت ہی قدیم عقیدہ ہے کہ آدمی جب مر جاتا ہے تو اس کی روح جس حال میں ہو اسی قسم کا ایک جسم تلاش کر کے اس میں داخل ہو جاتی ہے اور ہر آدمی کے اعمال یا قسمت اس پچھلی دروح کے کردار سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کو مسئلہ 'آواگون' کہتے ہیں۔ یہ مسئلہ ایک نہایت ہی دلچسپ مسئلہ ہے۔ اور یورپ کے بعض بڑے بڑے مفکرین بھی اس کے قائل ہیں کیونکہ یہ مسئلہ مقصدِ حیات کی بہت سی پیچیدگیوں کو ذہنی اعتبار سے حل کر دیتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مولانا رومیؒ کے مندرجہ بالا اشعار کی طرف اکثر فقرا اشارہ کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ یہ مسئلہ چونکہ بظاہر ارکان اسلام کے خلاف ہے اس لئے وہ اس میں قدم بڑھانے سے جھجکتے ہیں۔ گو در حقیقت اس میں کوئی غیر اسلامی بات نہیں ہے۔

ہم اکثر کتابوں میں اس قسم کے واقعات پڑھتے آئے ہیں۔ مثلاً حضرت رابعہ بصری نے کسی آدمی سے یہ فرمائش کی کہ ایک انسان سے تھوڑا سا تیل خرید کر لا دو۔ خادم نے سوال کیا کہ سب ہی انسان ہیں۔ میں کس سے خرید کر لا دوں۔ تو حضرت رابعہ بصری نے اپنے سر کا بال دیا اور کہا کہ اس کا حلقہ بنا کر اس میں سے دیکھو اور جو انسان نظر آئے اس سے خرید لو۔ خادم بازار کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ کسی کا سر گیدڑ کا ہے، کسی کا کتے کا، کسی کا کوے کا یا گدھ کا اور جسم بھی اسی طرح مختلف جانوروں کے ہیں۔ کچھ حصہ انسانی باقی جانور۔ آخر ایک شخص ایسا نظر آیا جو پورا انسان دکھائی دیا۔ خادم اس سے تیل خرید کر لے گیا۔

دن بھر کی مشغولیتوں سے فارغ ہو کر اور بابا صاحب سے رخصت لے کر خدّام رات کے گیارہ بجے کبھی کبھی سماع خانہ میں بیٹھ جایا کرتا ہیں۔ ایک دفعہ موضوعِ کلام تقدیر اور تدبیر تھا۔ ایک خادم نے یہ قصہ سنایا۔

کسی بادشاہ کے پاس ایک ملازم رہتا تھا۔ بیس سال کی طویل مدت دربانی کرتے ہوئے گزر گئی۔ ایک دن بادشاہ شکار پور گیا اور ایک ہرن کا پیچھا کرتے کرتے اپنی نشست گاہ سے اکیلا بہت دور نکل گیا۔ دوپہر کا وقت تھا ستانے کے لئے ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی نشست گاہ پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر دیکھا کہ اپنی بیش قیمت اور عزیز تلوار اسی درخت کے نیچے بھول آیا ہے۔ فوراً دربان کو بلایا اور نشانی بتا کر کہا کہ فوراً جائو اور تلوار واپس لے آئو۔ دربان وہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے کہ بادشاہ کی تلوار تو زمین پر رکھی ہوئی ہے اور بالکل بادشاہ کی شکل کا ایک شخص ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر پہرہ دے رہا ہے۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو؟ اس شخص نے جواب دیا کہ میں بادشاہ کی قسمت ہوں۔ اور اس کی تلوار کی حفاظت کر رہی ہوں۔ دربان نے کہا کہ میں بادشاہ کا بھیجا ہوا ہوں اور تلوار لینے آیا ہوں۔ قسمت نے اجازت دی کہ تلوار اُٹھالو۔ دربان جب چلنے لگا تو اس کو خیال آیا کہ یہ تو پوچھوں کہ آخر میری قسمت کہاں ہے۔ ہمت کر کے اس نے سوال کیا تو اس شخص نے جواب دیا کہ تم جس راستہ

سے آئے ہو بجائے اس راستہ کے یہ جو پہاڑیوں کے دامن سے راستہ گزرتا ہے اس سے لوٹو وہاں ایک غار ملے گا اور اس میں تمہاری ہی شکل کا ایک شخص سوتا ہوا پائو گے۔ اس کو ایک لات مار کر جگا دو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب یہ غار میں پہنچا تو بالکل اپنی ہی شکل کے ایک شخص کو سوتا ہوا پایا۔ دربان نے یہ کہہ کر کہ ارے کم بخت تجھے سوتے ہوئے بیس سال ہو گئے۔ نہ مجھ کو کوئی ترقی اور نہ ہی کسی قسم کی مراعات۔ اُٹھ! کہہ کر ایک لات ماری۔ وہ اُٹھ گیا اور کہا کہ جیتے جی اب کبھی نہ سوئوں گا۔ مت جائو۔ یہ خوش خوش لوٹ رہا تھا کہ دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ نہ معلوم بادشاہ سلامت کیا سزا دیں گے۔ لمبا راستہ اختیار کر کے میں نے بڑی دیر لگا دی۔ ڈرتے ڈرتے باشادہ کے روبرو حاضر ہو کر تلوار پیش کی۔ بادشاہ اپنی گرانقدر تلوار کو پا کر بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ دربان کو فوراً جمعدار بنا دیا جائے۔ یہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا واہ ری قسمت۔ کچھ دن گزرے ہوں گے کہ سالانہ دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ سلامت تخت پر تھے۔ دائیں بائیں دالان میں صف در صف، رئوسا اور حکام۔ اور جمعدار صاحب دروازہ پر کھڑے تھے۔ تخت کے پاس ثناخوانی ہو رہی تھی۔ اس کو خیال آیا کہ اگر سچ مچ میری قسمت جاگی ہوئی ہے تو اگر اُلٹا بھی کام کروں گا تو وہ بھی سیدھا ہو جائے گا۔ اس جاہل نے اپنا جوتا نکال کر سیدھا ایسا نشانہ لگایا کہ تاج پر لگا اور تاج سر سے زمین پر گر پڑا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ مگر فوراً ہی ایک ذاتی محافظ نے دیکھا کہ تاج میں ایک بالشت بھر کا سفید سانپ جو نہایت زہریلا ہوتا ہے بیٹھا ہوا ہے۔ اس سانپ کو فوراً مار ڈالا گیا۔ جمعدار کی اس حرکت کو جس محافظ نے دیکھا تھا اس نے جمعدار کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ تخت سے نیچے اُترا۔ اور جمعدار کو گلے سے لگا کر یہ کہا کہ تم میرے سچے دوست ہو۔ تم نے میری جان بچائی ہے۔ آج سے تم میرے وزیر ہو۔ وزیر صاحب مسکرا رہے تھے اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے۔ واہ ری قسمت، کچھ عرصہ گزرا اور وزیر صاحب کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ انفرادی حیثیت سے تو اُلٹے کام کر کے دیکھ لئے۔ اب ذرا رعایا پر بھی کوئی اُلٹا عمل کروں اور اگر وہ پھر بھی سیدھا بیٹھے، تو بات ہے۔

گرمیوں کا زمانہ تھا اور شہر کے ایک ہی تالاب میں بس اتنا پانی تھا کہ بارش کے ہونے تک پینے کے لئے کافی ہو اور بارش کے ہونے میں ابھی ایک ماہ کی دیر تھی۔ وزیر صاحب نے حکم دیا کہ تالاب کے بند کھول دو اور سارا پانی بہا دو۔ چنانچہ ایسا ہی گیا گیا۔ خلقت نے واویلا مچایا اور جا کر بادشاہ سے شکایت کی۔ مگر بادشاہ نے یہی جواب دیا کہ میرا وزیر بہت دانا ہے وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔ اگلے ہی دن اتنی بارش ہوئی کہ تالاب پُر ہو گیا اور اگر بند نہ کھول دیئے جاتے تو تالاب کے ٹوٹ کر شہر کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا۔ بادشاہ وزیر کی اس دانائی سے اتنا خوش ہوا کہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی اس سے کر دی اور سلطنت اس کے سپرد کر کے خود مستعفی ہو گیا۔ ہمارے بادشاہ سلامت دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے کہ واہ ری قسمت!

یہ تو ایک قصہ ہے مگر ایک بڑی اہم بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس چیز کو ہم قسمت کہتے ہیں وہ اپنے باطن کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ ظاہر اور باطن کے درمیان ایک آہنی دیوار ہے اور اس دیوار کو پار کرنا یقینی ہے۔ اپنے باطن تک پہنچنے اور اس کی

اصلاح کرنے کا راستہ فقیر خوب جانتا ہے۔ صوفیائے کرام کا کہنا ہے کہ آہنی دیوار قلب اور روح کے درمیان ہوتی ہے اور اس کو پار کرنے کا راستہ ہے صرف مَوْتُوْ قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْ یعنی مرنے سے پہلے مر جائو۔ حق ہے کہ اس میدان میں سر کٹانے سے پہلے تو کوئی قدم رکھ ہی نہیں سکتا۔

ایک دفعہ ایک خادم نے آپ سے عرض کی کہ حضور میں یہ دیکھتا ہوں کہ بظاہر فاسق و فاجر لوگوں کو بھی بغیر کسی محنت و ریاضت کے دولتِ سرمدی عطا ہوتی ہے اور برعکس اس کے صحیح النسب سادات جو بچپن سے عبادتیں بھی کرتے رہتے ہیں اور عملِ صالح بھی، خالی کے خالی رہ جاتے ہیں۔ حضور نے پہلے تو یہ فرمایا کہ یہ صلاحیت اور استعداد خون میں ہونی چاہیے مگر خادم کو تشفی نہ ہوتی۔ پھر ایک اور موقعہ پر جب ایک خادم نے ایک بہت اچھے شخص کی جو سادات سے تھے سفارش کی تو بابا صاحب نے کچھ رابعہ بصری والا ہی منظر دکھلایا۔ خادم نے دیکھا کہ وہ سید زادے دراصل ایک داڑھی والے بکرے کی شکل میں ہیں۔ تب یہ سمجھ میں آیا کہ باطن ظاہر سے علیحدہ ہے۔ یہ ایک ٹھوس اور پائیدار چیز ہے اور بزرگانِ دین اسی باطن کو دیکھ کر یہ دولتِ فقر عطا فرماتے ہیں۔ ظاہر کا باطن سے کتنا تعلق ہے۔ اعمال چاہے وہ صالح ہوں یا بد، ان کا باطن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بھید تب ہی معلوم ہوتے ہیں کہ باطن کا راستہ کھل جائے۔ عوام کے لئے یہ راستہ صرف موت کا دروازہ کھولتا ہے۔ اہلِ شریعت و طریقت کو بھی یہ راستہ جسمانی موت سے پہلے نصیب نہیں ہوتا۔ مگر اہلِ طریقت و معرفت کے نزدیک اس میدان میں انسان اسی وقت داخل ہو سکتا ہے جب وہ موت کے دروازہ کو زندگی ہی میں پار کر لے۔ یعنی موتو قبل ان تموتو کی راہ سے۔ یہ ہے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا راز۔ یہی ہے فنا اور بقا۔ اور یہی ہے نفی اور اثبات۔

سائنس بتاتی ہے کہ زندگی جو در حقیقت دروحِ ازلی ہے کن کن ارتقائی مقامات سے گزر کر انسانی جسم تک پہنچتی ہے۔ سائنس کے حساب سے اس کاوشِ فطرت کو تیس کروڑ سال لگے ہیں۔ سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ بطنِ مادر میں جب نطفہ جسم اختیار کرتا ہے تو حمل کے پہلے تین مہینوں میں یہ تیس کروڑ سال کی منزلیں جسمانی اعتبار سے طے کر لیتا ہے مثلاً یہ جسم مچھلی، چھپکلی وغیرہ وغیرہ کی شکلیں اختیار کرتا ہوا اور ان سے گزرتا ہوا انسان کی شکل میں آکر قیام پاتا ہے۔ گویا اس طرح ارتقاء جسمانی وجود میں آتا ہے۔ سائنس یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کے ذہن کا ارتقاء اور اس کا نفسیاتی ارتقاء مقامِ جسم کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے مثلاً ایسے بوڑھے لوگ ملیں گے جن کا ذہنی ارتقاء بچوں جیسا ہوتا ہے۔ اور ایسے بچے بھی ملیں گے جن کی سنجیدگی بوڑھوں کو مات کرتی ہے۔ یہی حال نفسیاتی مقامات کا بھی ہوتا ہے۔ ان مشاہدوں سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ انسان کی ساری صلاحیتیں ایک ساتھ اور قدم بقدم ترقی اور ارتقاء کی منزلیں طے کرتی جائیں۔ مثلاً یورپ کا دماغی ارتقاء کمال تک پہنچ گیا ہے۔ مگر نفسیاتی اعتبار سے غالباً وہ جانوروں کی منزل سے آگے نہیں نکلا۔ اور روحانی ارتقاء کا تو ذکر ہی کیا۔ ہندئوں کا مسئلہ آواگون اگر ہم

باطن کی طرف منسوب کر کے سوچیں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور کوئی بات اسلامی عقائد کے خلاف بھی نہیں پڑتی۔ اسلام کا یہ کہنا ہے کہ کلمہ گو کے لئے کوئی اور جسمانی زندگی نہیں ہے۔ یہ حق ہے، مگر ہیں کتنے ایسے کلمہ گو۔ خیر جھوٹ موٹ کی کلمہ گوئی ہی سہی۔ یہ جو ہم محمد الرسول اللہ کہتے ہیں اس لفظ کی محبوبیت کے صدقہ سے سب مسلمانوں کا بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ مگر موحدین کو چاہیے کہ وہ کسی مذہب کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہے ہوں۔ روح کے تمام ارتقائی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ فقیر کا مشن یہ ہے کہ یہ ساری منزلیں اسی زندگی میں پوری کرادے۔ گویا حقیقی معنوں میں انسان کو مومن بنادے۔ بابا قادر اولیا کے ایک خادم کا بیان ہے کہ جب اسے شرف خدمت بخشا گیا تو بشارت میں اسے دکھایا گیا کہ وہ ایک مرغا ہے۔ مگر اسی قیام کے دوران چالیس دن کے اندر اندر اس کی باطنی ہیئت بدلتی گئی۔ وہ پھر بکرا بنا۔ پھر سانبھر۔ پھر سفید عقاب۔ پھر خدا جانے کیا کیا تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ وہ کام جن کے لیے نظامِ کائنات کے ارتقا میں کروڑوں سال لگے ہیں، فقیر کی نظرِ کرم سے چند دنوں میں پورے ہو جاتے ہیں۔ ہندوئوں کے یہاں مردوں کو جلایا جاتا ہے۔ مگر جب کوئی کامل ہو جاتا ہے تو اس کو دفن کرتے ہیں اور جلاتے نہیں۔ واللہ شکر کرو کہ یہ خدا کا کتنا بڑا احسان ہے کہ تم نے مسلمان کے روپ میں جنم لیا۔ اگر تم چاہو تو اسی ایک چھوٹی سی زندگی میں تمہاری ذات میں وہ مقصدِ کائنات تکمیل پذیر ہو سکتا ہے۔ ایک قدم بڑھا تو میں تمہاری طرف دس قدم بڑھتا ہوں اور اگر تم میری طرف چلتے ہوئے آئو تو میں دوڑتے ہوئے تم تک پہنچتا ہوں۔ یہ حقیقتیں ہم سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں مگر قدم نہیں اُٹھاتے۔ انسان کتنا، اس کا یقین کتنا اور اس کا عشق کتنا، البتہ جب اُدھر سے فیضان شروع ہو جاتا ہے۔ تو دل چیخ چیخ کر گواہی دینے لگتا ہے۔ رحمت بے تاب ہے کہ میں برسوں۔ صرف ایک پردہ حائل ہے اور وہ ''میں'' کا پردہ ہے۔ فقیر کامل اپنی محبت، اپنی شفقت، اپنے احسان اور اپنی ستاری سے افراد کو اس ''میں'' کی رکاوٹ سے ایسی آسانی سے نکال دیتا ہے کہ جب وہ ہوش میں آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ بس ''تو ہی تو'' ہے۔ یہ عشق کا بھینا بھینا عرفان یہ معرفت کا میٹھا میٹھا یقین، یہ توحید کی وسعت کا نرم نرم اُجالا یہ ہے فقیر کا احسان، فقیر کا کام، فقیر کا مشن۔ انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی۔ جب یقین کامل ہو جاتا ہے تو بندہ صحیح معنوں میں بندہ ہو جاتا ہے اور بندگی کے رشتہ سے بندھ جاتا ہے۔ یہ رشتہ نماز ہے۔ نماز کیا ہے؟ کہتے ہیں قرۃ العین ہے۔ مگر کیا بات ہے کہ پچھلے تین سو سال سے چاہے حجرہ میں ہوں چاہے مسجد میں، انتہائی خشوع و خضوع سے ہم کھڑے ہوتے ہیں مگر ہماری آنکھوں میں اتنی بھی ٹھنڈک نہیں آتی جتنی کہ ایک بچھڑے ہوئے فرزند کو دیکھنے سے آتی ہے۔ کہتے ہیں نماز معراج المومنین ہے۔ اللہ اللہ ایک مومن کو دن بھر میں کم از کم پانچ دفعہ یہ معراج میسر آنی چاہیے مگر گذشتہ سینکڑوں سال میں کتنے ایسے مومن گزرے ہیں جن کو یہ معراج نصیب ہوئی ہے۔ نماز کیا چیز ہے۔ خدا کا حکم، ہر مسلمان پر فرض ہے اور فرض کو ہم جیسے بھی بنے ادا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ فرض سے سبکدوش ہو گئے!!

بابا قادر کے دربار میں ایک مجذوب رہتے تھے۔ ایک دن مجذوب کسی دوسرے کی طرف مخاطب ہو کر جو اپنے فرائض ادا کرتے رہتے تھے کہنے لگے۔ ارے تو نماز پڑھتا ہے ارے مُرغے کو دیکھ کر جب اللہ اکبر کہتے ہیں تو چھری گلے پر پھر جاتی ہے۔ اور مرغا جاں بحق ہو جاتا ہے۔ تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا تو اللہ اکبر سنتا ہی کیوں ہے۔ اسی طرح ایک خادم کو حکم تھا کہ وہ رات کو سوئے نہیں اور ذکر کرے اس بیچارے پر جب نیند کا غلبہ ہوتا تھا تو چائے منگوا کر پیتا تھا اور نیند کو بھگاتا تھا۔ یہی مجذوب ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ ارے ارے۔ جب تیری شادی کی دھوم دھام میں کافی رات گزر گئی تھی اور تجھے خلوت میں جانے میں دیر ہو رہی تھی تو کیا اس وقت بھی نیند کو بھگانے کے لئے چائے پینے کی ضرورت پڑی تھی؟ اس طرح ایک اور خادم تھے جو تسبیح ہاتھ میں لے کر ذکر کیا کرتے تھے۔ ان کا نام فرض کر لیجئے کہ کریم تھا۔ یہ مجذوب کہنے لگے کہ مان لے کہ میں ایک عورت ہوں اور میرا تجھ سے بیاہ ہو گیا تو کیا میں تسبیح ہاتھ میں لے کر کریم میرا دولہا، کریم میرا دولہا کا ورد کروں؟ ارے بیوقوف مجھے دیکھ میرے انگ انگ سے سہاگ ٹپکتا ہے اور سہیلیاں دُور سے انگلی سے بتاتی ہیں کہ وہ دیکھو سہاگن جاری رہی ہے۔

نماز، حضوری۔ یہ چیزیں ظاہر داری کے خول سے حاصل نہیں ہوتیں۔ فقیر کی نماز حقیقت کی نماز ہوتی ہے، قراۃ العین ہوتی ہے۔ آہ! ایک قلندر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ مسلمان اپنی جنت و دوزخ کے وسوسوں میں رہیں تو مومن کی انتہائے تمنا دیدارِ الٰہی ہوتی ہے۔ اور یہی جنت کا آخری مقام بتایا جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی صحیح معنوں میں کسی مجازی معشوق سے بھی عشق کیا ہے؟ کبھی اپنے معشوق کے مقابل بیٹھے ہو؟ وہ دل کی دھڑکنیں، وہ حیا اور حوصلہ کے مقدمے، وہ ایک نظر، وہ ایک دیدار، وقت ساکت، دل مجلیٰ، آنکھیں منور، نہ کلام نہ پیام، نہ سجود نہ قیام۔ ایک حضوری کا عالم ہوتا ہے۔ یہ ہے پہلی منزل عشق کی معراج، یہ ہے نفس و حواس کی معراج۔ یہ ہے ان مٹی کی آنکھوں کی معراج۔

مگر حقیقت کے اعتبار سے حُسن حُسن ہے، کیا مجازی کیا حقیقی۔ مجازی کے پس پردہ وہی کارگر ہے۔ سوجو، مومن کے دل میں کیا ہے۔ اس کی معراج کیا ہوتی ہے۔ بندہ کو جب اپنا مقام حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا قیام روح میں ہو جاتا ہے۔ تو وہ اللہ اکبر کہہ کر جب قیام میں ہوتا ہے تو حیرت اس بات کی ہوتی ہے کہ بحضور کبریائی اس کے ہوش کیسے قائم رہتے ہیں۔ سبحان ربی العظیم عظمت کی تعظیم کرتا ہے۔ اور عجز و نیاز سے قدمبوسی کرتا ہے۔ سبحان ربی الاعلیٰ۔ انا اعطینٰک الکوثر۔ آہ وہ معراج کے راز و نیاز۔ اف کیا مجبوری ہے۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ موجودہ مسلمان تو نماز کی مجبوری سمجھتے ہیں۔ فقیر نماز کے اختتام پر مجبوراً سلام پھیرتا ہے۔ بندہ کے پاس اپنا کچھ نہیں رہ جاتا۔ معبود کی رضا اپنا دین ہوتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں پانچ وقت قدمبوسی نصیب ہوتی ہے۔ افضل ہے وہ فقیر جو نماز کا بھید افشا کر دے۔

تو سامنے ہو میں سجدہ کروں

بابا جان قبلہ اپنے خدام کو باطن سے ظاہر کی طرف لاتے ہیں۔ اور جب وہ معبود کی حقیقت سے آشنا ہو جاتے ہیں تو انہیں نماز بھی پڑھنے کے لئے کہا جاتا ہے۔ شریعت میں تو یہ حکم ہے کہ نماز قضا ہو جائے تو دُرے مارے جائیں مگر حقیقت کی یہ رسم ہے کہ اگر گھڑی کے لئے بھی، سوتے جاجاگتے، اچھائی یا برائی میں۔ غرض ہر حال میں اگر ایک گھڑی کے لئے بھی ذکر خفی بند ہو جائے تو اس کی گردن اُڑادی جائے۔ یہ اس کی روح کی موت ہے۔

اہل طریقت ذکر و اذکار کے لئے ایک دانا نباض حکیم کی طرح مزاج کی موافقت کے لحاظ سے اسمائے الٰہی میں سے کوئی اسم یا آیات قرآنی میں سے کچھ عطا کرتے ہیں۔ اس عطا اور اجازت میں بھی بڑے رمز ہوتے ہیں۔ جیسے ایک مشفق باپ اپنے فرزند کو تجارت میں لگانا چاہے تو اپنی کمائی کا کافی حصہ دے کر اسے تجارت شروع کرواتا ہے۔ اسی طرح اجازت کے معنی بھی یہی ہوتے ہیں کہ پیر طریقت اپنی کمائی کا کافی حصہ مرید کو بخش دیتا ہے کہ اس سے ریاض کرے اور دولت کو بڑھائے عطا کچھ اور چیز ہے۔ یہ پیر حقیقت گویا اپنے آپ کو عطا کرتا ہے کیا احسان ہے۔ اکثر فقراء اسم ذات کے ذکر کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ نقشبندیہ سلسلہ میں یہ لفظ اللہ ہے۔ اس کی تجلیاں اور اس کی برکات۔ اللہ اکبر جل جلالہٗ جل شانہٗ اہلِ حقیقت کے یہاں اسم ذات وہی ہیں جو حقیقتاً دل میں ہوں۔ یہ ذکر خفی ہے۔ یہ عطا ہی ہوتا ہے۔ کسب سے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ اور جو عطا ہو جائے تو کبھی نہیں چھوٹتا۔ مرشد کے حکم کے سوا کوئی اور طاقت چھڑا بھی نہیں سکتی۔ یہ انسان کو ذات کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ بقاول کسے۔

ایسی رنگ دو رنگ ناہیں چھوٹے

دھوبیا دھوئے چاہے ساری عمریا

اب صفاتِ الٰہی کے حاصل کرنے کی کوشش کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ خود بخود پھول کی خوشبو کی طرح پھوٹ کر نکلنے لگتی ہیں۔

غزل

میرے من میں رہتا ہے ساجن کا ڈیرا

یہاں ہر گھڑی ہے سویرا سویرا

جو پریتم کی اچھا سو پریمی کی اچھا

یہ چنتا کہ دنیا اندھیرا اندھیرا

تگری بھینٹ کرنے کو کیا اور لائوں

یہ جیون کا چولا بھی ہے دان تیرا

ہری اوم پیتم۔ ہری اوم پیتم

تری آرتی ہے ہر اک سانس میرا

کنول بن کے بھگوان کی شوبھا دکھائو

ہے مکتی کے ساگر میں تیرا بسیرا

(رحمن بابا)

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے

تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

کُٹیا میں بھگوان گنوایو ڈھونڈے دیس پرائے

نگر نگر کی ماٹی پھانکے جب بھی ہاتھ نہ آئے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے

تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

بھیس بدل کر پھری اکیلا کوئی گرو کوئی چیلا

سکھشا کالے پیسہ دھیلا تن کی موج منائے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے

تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

دھرتی اور آکاش سنو وارے ناپے تو نے چاند اور تارے

دیکھے بھالے ساگر سارے اپنا انت نہ پائے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے

تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

ودیا شکتی کو اپنایا مایا کا ایک کھیل رچایا

جو کچھ پایا سو ہی گنوایا کیسے گھر کو جائے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے

تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

پریم کرے اور جگ کو ہنسائے بھلا کرے اور برا کہائے

جگ میں پیت کی ریت نرالی پھول تو دے اور پتھر پائے

کس پر تو اترائے بندے جھوٹے ٹھاٹھ بنائے

تجھ کو سوچ نہ آئے بندے جیون بیتا جائے

(رحمن بابا)

دوہے

موہے تن سے کام نہیں میں من کا ہوں متوالا

من میں پیتم جھولا جھولے پی کر پریم پیالا



نین برسوں ساون بھادوں تو من جھولا جھول

پیتم پیتم گائے جا سب دُکھ دلدر بھول

(رحمن بابا)